ڈاکٹر جواز جعفری
شعبہء اردو، ایم اے او کالج، لاہور

لاہور کی ادبی روایات میں قہوہ خانوں کا کردار

Arabic "Qahwa Khana" is a place where people sit and parley over a Cup of Qahwa. The tradition of "Qahwa Khana" is present all over the world. In all important cities of the world, such Qahwa Khanas are the center of Artistic Catharsis. Qahwa Khana seems epoch making for flourishing novel idea and approach. In the Twentieth Century,Lahore Qahwa Khanas were providing places to writers.

لوہر، لوہاور، لیہارو، لہانور، لوہ پور، لوہ کوٹ، لہا اور لوہور یہ وہ بدلتے ہوئے نام ہیں جن سے مختلف زمانوں اور مختلف اوقات میں شہر لاہور موسوم بہ ہوتا رہا۔ لاہور کی بنیاد کب پڑی، اس سوال کا جواب دینا خاصا مشکل ہے۔ البتہ مسلمانوں کی ہندوستان پر یلغار سے بہت پہلے لاہور ایک اہم مقام کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ پرانوں کی کہانیوں کے ابتدائی سلسلے کے ساتھ اس کا تعلق، راجپوتانہ کے وقائع نگاروں کی شہادت، کشمیر کے روزنامچے اور آس پاس کے علاقے سے دریافت ہونے والے سکّے، لاہور کی قدامت اور سیاسی اہمیت کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بعض مورّخین کا قیاس ہے کہ لاہور کی بنیاد دوسری اور چوتھی صدی عیسوی کے درمیان رکھی گئی یا پھر اس دَور میں اس شہر نے ثقافتی و سیاسی اہمیت اختیار کی۔[1]

قدیم لاہور شہر موجودہ جائے وقوع پر آباد نہیں تھا۔ یہ شہر اچھرہ گاؤں کے آس پاس یعنی موجودہ لاہور سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ شاید اس لیے پرانی دستاویزات میں اچھرہ کو، اچھرہ لاہور کہا جاتا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق محمود غزنوی کے حملے کے وقت قدیم لاہور خستہ حالت میں تھا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم تھا ایک حصے کو تلواڑہ اور دوسرے کو رڑا، کہا جاتا تھا۔ تلواڑہ وہ تھا جہاں آج کل ٹکسالی دروازہ موجود ہے اور بلند جگہ پر واقع ہونے کے باعث بھی کے نام سے مشہور ہے جبکہ رڑا، وہ علاقہ کہلاتا تھا جہاں ان دنوں مسجد وزیر خاں واقع ہے۔[2] ہندی دیومالائی قصوں میں لاہور کا بانی ہندوستان کی عظیم رزمیہ داستان رامائن کے ہیرو مہاراجہ رام چندر کے بیٹے لو یا لوہ کو مانا جاتا ہے۔ صاحبِ خلاصۃ التواریخ بھی اس قول کی تائید کرتا ہے کہ لاہور اور قصور شہر مہاراجہ رام چندر کے بیٹوں لو اور کشو نے (بالترتیب) آباد کیے مگر شیخ احمد زنجانی نے اپنے رسالے تحفۃ الواصلین (جو 435ء میں سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور ہی میں لکھا گیا) خلاصۃ التواریخ سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ لاہور کو راجا پرتھوت نے، جو پانڈوؤں کی اولاد تھا، آباد کیا البتہ راجہ بکرماجیت کو اس شہر کو ایک بار پھر آباد کرنا پڑا۔

اس کے بعد سمند پال جوگی تخت نشین ہُوا تو اس نے لاہور کا نام اپنے نام پر سمند پال نگری رکھ دیا۔ راجا دیپ چند

نے اپنے زمانہء اقتدار میں پنجاب کا علاقہ اپنے بھتیجے لوہار چند کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ لوہار چند نے سمند پال نگری بدل کر اس کا نام اپنے نام پر لوہار پور رکھا جو کثرتِ استعمال سے لاہور بن گیا۔[3] مختلف روایات کے مطابق البیرونی نے اسے لوہاور، شیخ المشائخ نظام الدین بدایونی دہلوی نے ''فوائد الفوائد'' میں لہانور، اور حضرت امیر خسرو نے اپنی تصنیف ''قران السعدین'' میں پہلی بار اسے 'لاہور' کے نام سے موسوم کیا۔ ان کا شعر ہے۔

ازحدِ سامانہ تا لاہور
ہیچ عمارت ز مگر در قصور

اس شعر سے ملنے والی گواہی سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی آتے آتے یہ شہر لاہور کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

مغلیہ عہد سے قبل پنجاب کا دارالحکومت دیپالپور تھا مگر شہنشاہ ظہیرالدین بابر اور ہمایوں بادشاہ کے عہد میں پنجاب کے پایہ تخت ہونے کا تاج ،دیپالپور کے سَر سے اتار کر لاہور کی پیشانی کی زینت بنایا گیا۔ لاہور کو جغرافیائی اعتبار سے یہ اعزاز حاصل رہا کہ یہ ایک ایسے علاقے کے طور پر جانا جاتا ہے جو تاریخی طور پر بڑے بڑے لشکروں کی گزرگاہ رہا، یہ شہر مختلف خطوں سے ہجرت کر کے اس علاقے میں وارد ہونے والی قوموں کا مسکن رہا اور یہی وہ شہر ہے جہاں بڑے بڑے حکمرانوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے رہے۔

لاہور شہر اپنے میلوں ٹھیلوں، تاریخی حویلیوں، شاندار باغوں، بزرگانِ دین کے مزاروں، تعلیمی اداروں، سینماہالوں، مذہبی و ثقافتی تہواروں، اہلِ علم کی بیٹھکوں، قدیم لائبریریوں، لذیذ کھانوں، پہلوانی کے اکھاڑوں اور تاریخی دروازوں کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کے شعراء ،ادباء، علماء، پہلوان، موسیقار، فنکار، سیاستدان، رؤساء، کھلاڑی، مصوّر، ڈیرے دار طوائفیں، صحافی اور ہنرمند پُوری دنیا سے اپنے فن کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئے۔

سچ تو یہ ہے کہ کوئی کتنا بڑا ہنرمند کیوں نہ ہو اگر لاہور نے اس کے فن پر مُہرِ تصدیق ثبت نہیں کی تو وہ کمال کی بلندیوں تک نہ پہنچ پایا۔ اس کے برعکس جس ہنرمند کو اہلِ لاہور نے سند عطا کر دی، وہ دنیا کے ہر کونے میں سرخرو ہوا۔ لاہور کو سماجی و ثقافتی حوالے سے اس بلند معیار پر پہنچانے کے لیے لاہور کے ہنرمندوں، تخلیق کاروں اور اہلِ علم نے عہد بہ عہد کام کیا۔ لاہور ایک ایسا تہذیبی شہر ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے اپنے علمی و ثقافتی معیارات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ ان معیارات کے فروغ کے لیے مختلف شخصیات، انجمنوں اور اداروں نے دن رات کام کیا۔ ان ثقافتی اقدار کے فروغ کے لیے ایک طرف تو اہلِ علم وفن کی ذاتی بیٹھکوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا جو نہ صرف مل بیٹھنے کا ذریعہ بلکہ خیالات کے تبادلے کا بھی اہم وسیلہ تھیں، دوسری طرف بیسویں صدی کے دوران منظرعام پر آنے والی وہ انجمنیں اور تنظیمیں ہیں جنہوں نے علم و ادب کے فروغ اور ثقافتی اقدار سازی کے لیے قوتِ محرّکہ کا کردار ادا کیا، جبکہ تیسری طرف لاہور کے وہ قہوہ خانے تھے جو صبح سے لے کر رات گئے تک اہلِ علم کے وجود سے آباد رہتے تھے۔ ایسے قہوہ خانے لاہور سمیت شنگائی، دلّی، بغداد، سمرقند، بخارا، قرطبہ، قاہرہ، فرغانہ، دمشق، شیراز، اصفہان، ماسکو، لندن، پیرس، فرینکفرٹ، واشنگٹن اور بہت سے دیگر شہروں میں موجود رہے ہیں جن کا اپنا خمیر نہ صرف تہذیب و ثقافت سے اٹھا بلکہ یہ شہر دنیا کو علم و ادب اور تہذیب کے معیارات بھی فراہم کرتے ہیں۔ ایسے قہوہ خانے دنیا کے جس بھی شہر میں ہوں گے وہ اہلِ علم کے درمیان

قدیم و جدید خیالات کی نشر گاہوں اور معاشرے میں مکالمے کے فروغ کے نیشنل سنٹرز کا کام دیں گے۔ پیرس کا وہ قہوہ خانہ جہاں ژاں پال سارتر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا اس کی زیارت کے لیے ہزاروں سیاح آج بھی پیرس کا رُخ کرتے ہیں۔

گذشتہ صدی کا لاہور آج سے قدرے مختلف تھا۔ آبادی نہ صرف کم تھی بلکہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائیوں اور پارسیوں پر مشتمل تھی اور سبھی بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ جگہ جگہ باغات تھے اور بیشتر گھروں کے باہر پھولوں کی بیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ لاہور کی مال روڈ پر کبھی کبھار کوئی موٹر گزرا کرتی تھی۔ لوگ مال روڈ پر واک کے لیے نکلا کرتے۔ اصلی شہر تو وال سٹی (فصیل کے اندر) تھا مگر کرشن نگر، شام نگر، سمن آباد، اور ماڈل ٹاؤن جیسے چند محلے وجود میں آ چکے تھے۔ لوگ فارغ البال تھے اور ان کا بیشتر وقت قہوہ خانوں میں گزرتا تھا۔ ان قہوہ خانوں میں اگرچہ عام لوگوں کا داخلہ ممنوع نہ تھا مگر چند قہوہ خانے ایسے بھی تھے جن میں ہر وقت ادیبوں، شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ہم خیال ادیبوں کے گروہ نئے نئے قہوہ خانوں کی تلاش میں رہتے جیسے ہی کوئی نیا قہوہ خانہ کھلتا اسے آباد ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی تھی۔ قہوہ خانوں کی رونقوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں لوگوں کے اندر ادب کا ذوق پایا جاتا تھا اور وہ ادیبوں شاعروں کو ہیروز سمجھتے تھے۔ چنانچہ لوگ چائے پینے کے بہانے ان قہوہ خانوں کے چکّر لگاتے تاکہ اپنے اپنے پسندیدہ ادیبوں شاعروں کو دیکھ سکیں اور ان سے چند باتیں بھی کر سکیں۔

دنیا کے ہر شہر میں قہوہ خانے درمیانے طبقے کی زندگی کا لازمی جزو ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ قہوہ خانے بند کر دیئے جائیں تو گویا یہ عمل دانشور طبقے کی بچی کھچی خوشیاں بھی ختم کر دینے کے مترادف ہوگا۔ پریشانیوں سے بھری زندگی میں قہوہ خانے اہلِ قلم کی آخری پناہ گاہ ہیں۔ قہوہ خانے کسی بھی معاشرے کی تہذیبی زندگی کا نشان بھی ہیں اور زوال کا پیمانہ بھی۔ کسی معاشرے میں قہوہ خانوں کی موجودگی اس کی ذہنی بلوغت کے معیار کا پتہ دیتی ہے۔ پچھلی صدی میں لاہور میں ایسے درجنوں قہوہ خانے تھے جہاں اس شہر کے دل و دماغ جمع ہوتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لاہور شہر کی علمی اور ثقافتی تاریخ ان قہوہ خانوں کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ قہوہ خانے مختلف ادبی گروپوں کے لیے وقف ہُوا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن میں ہر طرح کے ادیب آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان ادیبوں کے تبادلہء خیالات کے نتیجے میں نہ صرف نئے نئے موضوعات پر شاندار گفتگوئیں سننے کو ملتیں بلکہ یہیں پر مختلف ادیبوں اور نظریاتی گروپوں کے درمیان بڑے بڑے مباحثے، مناظرے، مجادلے اور محاربے بھی دیکھنے اور سننے کو ملتے تھے۔

یہ انگریزی عہد کے عروج کا زمانہ تھا، انگریز برصغیر میں صرف ہتھیار لے کر نہیں آئے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی تاریخ، ادبیات، کھانے، مشروبات اور آدابِ معاشرت بھی لائے تھے۔ انہی مشروبات میں سے چائے بھی ایک مشروب تھا۔ برصغیر میں انگریزوں ہی نے چائے کو متعارف کروایا اور فروغ دیا۔ اس سے قبل مقامی آبادی قہوہ (جو عربی زبان کا لفظ ہے، یہ ایک طرح کا تخم ہوتا ہے جسے پانی میں جوش دے کر پیتے ہیں) استعمال کرتی تھی اور قہوہ خانہ ایسی دکان ہوتی ہے جہاں لوگ قہوہ پیتے اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ قہوے کے ساتھ گپ شپ یا تبادلہء خیالات ایک لازمی امر ہے۔ گویا قہوہ خانے انسان کی ذہنی تربیت کے مراکز تھے اور لاہور ان قہوہ خانوں کے حوالے سے خاصا خود کفیل تھا۔ گذشتہ صدی کے ربع اول میں انگریزوں نے عوامی سطح پر چائے اور بناسپتی گھی کو باقاعدہ متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ بناسپتی گھی کو تو عوام

میں جگہ بنانے میں خاصی دیر لگی مگر چائے کو قہوہ خانوں، اہلِ علم کے حلقوں اور اشرافیہ کی محفلوں میں بار پانے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شروع میں چائے کو عوام میں متعارف کرانے کے لیے مختلف کمپنیوں کو ٹی سٹال لگوانا پڑے۔ کیونکہ اَن پڑھ عوام میں چائے کے خلاف اندر ہی اندر ایک پراپیگنڈہ مہم بھی جاری تھی، جس کے توڑ کے لیے چائے کی کمپنیوں نے مختلف سلوگنوں کا سہارا بھی لینا شروع کر دیا تھا۔ اہلِ لاہور کو چائے کا عادی بنانے کے لیے انڈیا ٹی سیس بورڈ نہ صرف لوگوں میں مفت چائے تقسیم کرتا تھا بلکہ لوگوں میں چائے کے حوالے سے پائے جانے والے شبہات کو دُور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اس قسم کے سلوگن بھی آویزاں کراتا تھا۔ مثلاً ''چائے ملیریا کو دُور ہٹاتی ہے، چائے پینے سے ملیریا نہیں ہوتا، گرم موسم میں چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سلوگن ہر قہوہ خانے کے باہر آویزاں کیے جاتے تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں ان قہوہ خانوں میں چائے خوب مقبول ہو رہی تھی۔ چائے کا کوپ یا کُوزہ (مٹی کا کُوزہ) دو پیسے میں دستیاب ہونے لگا جس میں شکر استعمال ہوتی تھی جبکہ چینی چائے کے کُورے کی قیمت ایک آنہ (چار پیسے) ہوا کرتی تھی۔

لاہور میں جگہ جگہ قہوہ خانے موجود تھے مگر ہم یہاں ان قہوہ خانوں کا تذکرہ کریں گے جن میں شاعر ادیب اور دانشور بڑی تعداد میں اُٹھتے بیٹھتے تھے، اور ان قہوہ خانوں کے تذکرے ریڈیو، اخبارات اور ٹی وی تک پہنچ چکے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے یہ قہوہ خانے اور شاعر ادیب لازم و ملزوم تھے۔ ادیب شاعر ان قہوہ خانوں میں اس قدر کثرت سے بیٹھتے تھے کہ ان قہوہ خانوں کا ادبی تشخص پُوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان قہوہ خانوں کے بغیر لاہور کی ذہنی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے چند قہوہ خانوں کا تذکرہ اس مضمون میں کیا جا رہا ہے۔

ا۔ عرب ہوٹل:

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں اہلِ قلم کی سب سے زیادہ توجہ عرب ہوٹل نے کھینچی۔ یہاں ادب، صحافت اور سیاست کا خوبصورت امتزاج دیکھنے میں آیا۔ اپنے عہد میں یہ لاہور کے اہلِ قلم کی سب سے پُر رونق نشست گاہ تھی۔ عرب ہوٹل بے شمار ادیبوں اور صحافیوں کے لیے جائے مکاں تھا۔ ایسے ادیب جن کے گھر اسی علاقے میں واقع تھے وہ عام طور پر اس ہوٹل کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ عرب ہوٹل لاہور کے مشہور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے سامنے واقع تھا۔ بقول اے حمید یہ ہوٹل عرب امارات سے ہجرت کر کے لاہور آنے والے دو عربی النسل بھائیوں نے بنایا تھا۔[4] عرب ہوٹل آج کی طرح کا کوئی خوبصورت ریستوران نہ تھا بلکہ ایک دکان کی طرح تھا۔ ایک طرف لکڑی کی پانچ چھ کرسیاں، درمیان میں بڑی میز، سامنے والی دیوار کی طرف بھی دو تین کرسیاں۔ ہوٹل کے پیچھے تنور جہاں ہر وقت تازہ روٹیاں لگا کرتی تھیں اور دوسری طرف کچن واقع تھا۔

اس زمانے کے ادیبوں اور صحافیوں کی ایک پوری کہکشاں تھی جو ،اس ہوٹل کے آسمان پر چمکا کرتی تھی۔ ن۔م۔راشد، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیار پوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر علیم الدین سالک، سیّد عبداللہ اور ایم ڈی تاثیر یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے جبکہ کبھی کبھار آنے والوں میں مولانا ظفر علی خان ، حاجی لق لق اور وقار انبالوی بھی شامل تھے۔ جہاں تک صحافیوں کا تعلق ہے ان میں چراغ حسن حسرت تو خیر اس قافلے کے میرِ کارواں تھے اور اس زمانے میں ''زمیندار'' میں فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے، ان کا بیشتر وقت اسی ہوٹل میں

گزرتا تھا۔ ان کے علاوہ عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ (جو ہوٹل کی ساتھ والی گلی میں رہائش پذیر تھے اور خود کو کمیونسٹ ادیب کہلوانا پسند کرتے تھے) عبداللہ ملک، ہری چند چڈھا، حکیم محمد حسن قریشی، حسن اختر کیانی یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے عرصے تک عرب ہوٹل لاہور کی ثقافتی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس ہوٹل کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں بیشتر مسلم اخبارات کے دفاتر ریلوے روڈ اور سرکلر روڈ پر ہُوا کرتے تھے۔ زمیندار، احسان، سیاست، شہباز، انقلاب، آزاد اور کئی دوسرے اخبارات انہی مقامات سے شائع ہوتے تھے، اسی لیے بڑے بڑے صحافی عرب ہوٹل ہی کا رُخ کرتے تھے۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ ساتھ فیروزالدین اور کرم سنگھ مان جیسے سٹوڈنٹ تنظیموں کے کمیونسٹ راہنما بھی طلبہ سیاست کے داؤ پیچ اسی ہوٹل میں بیٹھ کر آزمایا کرتے تھے۔

معروف بھارتی صحافی گوپال متّل اس زمانے کے عرب ہوٹل کی یاد تازہ کرتے ہوئے اسے لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈّا قرار دیتے ہیں۔ یہاں بیٹھنے والے ادیب، شاعر اور صحافی ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل تو تھی ہی مگر وقت پر بھی نہ ملتی تھی اور کبھی کبھی ایک دو ماہ کا ناغہ بھی ہو جاتا تھا۔ یہ اہلِ قلم ہر حال میں اپنے حال میں مست رہتے اور اپنی زندہ دلی پر غم کی پرچھائیں نہ پڑنے دیتے تھے۔[5]

عرب ہوٹل غریب نواز تو تھا ہی مگر یہاں بیٹھنے والے اہلِ قلم میں بھی ایک طرح کا بھائی چارہ تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سگریٹ، پان اور کھانے سے بھی محروم رہ جائے گا۔ یہاں بیٹھنے والے ادیب قلندر صفت تھے۔ کبھی کوئی کتاب لکھ دی، کسی کتاب کا ترجمہ کر دیا اور کسی رسالے کے لیے افسانہ یا مضمون لکھ دیا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا قناعت تھی۔

عرب ہوٹل پہلی جنگِ عظیم سے لے کر تقسیمِ ہندوستان تک لاہور کی ثقافتی سرگرمیوں کا محور بنا رہا، بڑے بڑے علمی و ادبی مباحث نے یہیں سے جنم لیا، اُدب اور صحافت کے جدید رجحانات یہیں پروان چڑھے۔ قیامِ پاکستان اور جنگِ عظیم دوم دو ایسے واقعات تھے جن کے نتیجے میں عرب ہوٹل کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ چراغ حسن حسرت اس ہوٹل کی ذہنی زندگی کے روحِ رواں تھے مگر جنگ کے بعد کی کساد بازاری نے انہیں سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا، باری علیگ لاہور چھوڑ کر رنگون روانہ ہو گئے، ن۔م۔راشد عرب ہوٹل سے اُٹھ کر ملتان چلے گئے، اختر شیرانی ٹونک اور حفیظ ہوشیارپوری اور کرشن چندر دہلی سدھار گئے۔ یوں ایک عرصے تک لاہور کی ذہنی زندگی کی ترجمانی کرنے والا عرب ہوٹل ویران ہو گیا بلکہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ریلوے روڈ اور سرکلر روڈ کا پُورا علاقہ پس منظر میں چلا گیا۔ بچے کھچے صحافی، شاعر اور ادیب عرب ہوٹل سے اُٹھ کر کافی ہاؤس، لارڈز ہوٹل اور میٹرو ہوٹل چلے آئے جہاں بیٹھ کر وہ عرب ہوٹل میں گزری زندگی کے یادگار دنوں کو یاد کیا کرتے تھے۔

2۔ میٹرو ہوٹل:

میٹرو ہوٹل جس عمارت میں واقع تھا یہ میلہ رام بلڈنگ کہلاتی تھی، میلہ رام لاہور کا ایک بڑا ہندو سرمایہ دار تھا اور اس کے نام سے لاہور میں بہت کچھ موجود تھا۔ داتا دربار کے قریب میلہ رام ٹیکسٹائل ملز ہُوا کرتی تھی، کشمیر روڈ پر میلہ رام کا احاطہ تھا، اسی احاطے میں قیامِ پاکستان کے بعد لُٹے پٹے پناہ گزیں آ کر ٹھہرے۔ بھاٹی دروازہ کے اندر اس کی کوٹھی جبکہ داتا دربار کے قریب لال کوٹھی تھی (جہاں اب حزب الاحناف ہے) آج جہاں واپڈا ہاؤس ہے یہ بھی میلہ رام کی بلڈنگ

کہلاتی تھی، اس کے پہلے فلور پر رمنگٹن ٹائپ رائٹر کا آفس تھا۔ پرانی وضع کی اسی جہازی بلڈنگ میں روزنامہ مغربی پاکستان کا دفتر تھا۔ اوپر جانے کے لیے چوڑے پھٹوں کی سیڑھیاں چڑھتی تھیں، میٹرو ہوٹل اسی عمارت میں واقع تھا۔[6] میٹرو ہوٹل کے سامنے وکٹوریہ سٹیچو (ملکہ کا مجسمہ) تھا جس کے اردگرد خوبصورت درختوں کا جُھنڈ ہُوا کرتا تھا۔ ایوب خاں کے زمانے میں یہ درخت کٹوا دیے گئے اور ملکہ کا مجسمہ عجائب گھر کی زینت بنا دیا گیا۔ میٹرو ہوٹل کے ساتھ الفلاح بلڈنگ ہے جہاں کبھی لیبر کورٹ ہُوا کرتی تھی۔

میٹرو ہوٹل شہر کے تین چار بڑے ہوٹلوں میں سے ایک تھا اور فلیٹیز اور برگنزا کی طرح انگریزی وضع کا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے، گراؤنڈ پر ریستوران اور ڈانسنگ فلور تھے، جہاں شام کو اینجلا نامی اینگلو انڈین ڈانسر انگریزی دُھنوں پر رقص کیا کرتی تھی۔ ہوٹل کے خوبصورت لان کے باغیچے میں پنجاب اسمبلی کی عمارت کی طرف گارڈینیا کی سرسبز دیوار کے ساتھ کرسیاں بچھی رہتی تھیں جہاں شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ یہاں محفل جمانے والوں میں چراغ حسن حسرت، حمید نظامی، حنیف رامے، مظفر احسانی، وقار انبالوی، ظہور عالم شہید، انتظار حسین، ابنِ انشاء اور حسن عسکری سمیت بہت سے دوسرے ادیب اور صحافی شامل تھے۔ میٹرو ہوٹل کی نشاندہی اور اس سے وابستہ یادیں تازہ کرتے ہوئے اے حمید کا کہنا ہے کہ اسمبلی ہال کے بالمقابل اور واپڈا ہاؤس کی عظیم الشان بلڈنگ کے نیچے میٹرو ہوٹل کی لاش دفن ہے۔ اس مدفن میں کہیں چراغ حسن حسرت کے لطیفوں کی پھلجھڑیاں، کہیں محمود اختر کیانی کے قہقہوں کی گونج، کہیں باری علیگ کے طنزیہ جملوں کے نشتر اور کہیں ڈانسر اینجلا کے گھنگھرو بکھرے پڑے ہیں۔ واپڈا ہاؤس کے اس اہرامِ جدید کے تہہ خانوں میں پرانی یادوں کی ممیوں کے تابوت ہیں، ان تابوتوں کے سرہانے بجھے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور موتیے کے پھولوں کے مرجھائے ہوئے ہار پڑے ہیں۔[7]

عرب ہوٹل کے ویران ہو جانے کے بعد میٹرو ادیبوں کی نئی جائے پناہ تھا، اب یہاں بیٹھ کر ادب، صحافت، سیاست، فنون، تاریخ اور ثقافت پر مباحث ہوتے اور اے حمید سے لے کر نواز، انور جلال شمزا (مصوّر) معین نجمی اور انتظار حسین تک اپنے علم کے موتی بکھیرتے۔

میٹرو ہوٹل میں داخلے کے لیے گارڈینیا کے ایک محرابی دروازے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ڈریس کوٹ کی شرط لازمی تھی، شروع میں پتلون اور ٹائی پہننا لازمی تھا مگر بعدازاں شلوار اور اچکن پہننے والوں کو بھی داخلے کی اجازت مل گئی۔ دروازے سے اندر جاتے ہی دائیں طرف وسیع و عریض ڈانسنگ ہال تھا اور بائیں طرف گارڈینیا کے قدِ آدم پودوں کی باڑھ جس نے ہوٹل کے لان کو تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ باڑھ کے ساتھ موتیے کے پھول تھے اور درمیان میں گول فرش جس پر شام کو اینجلا رقص کیا کرتی تھی، گول فرش کے گرد میزیں بچھی ہوتیں جن پر بیٹھے لوگ چائے اور رقص سے لطف اندوز ہوتے۔ ان دنوں لاہور کے ہوٹلوں میں ڈنٹرِ رز پر پابندی نہ تھی، سٹینڈرڈ، سٹیفلو اور میٹرو جیسے ہوٹلوں میں یہ سہولت عام تھی، جب شراب پر پابندی لگی تو یار لوگوں نے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے اب شراب بوتل کی بجائے چائے کی کیتلیوں میں فراہم کی جانے لگی۔ اگر کبھی چھاپہ پڑتا تو ہوٹل انتظامیہ ایک دو روز کے لیے احتیاط کرتی، اس کے بعد دوبارہ لنگر جاری ہو جاتا۔ میٹرو ہوٹل میں دو نسوانی مجسمے بھی رکھے گئے تھے۔ شہر میں جب فحاشی کے خلاف مہم زوروں پر ہوتی تو ان نیم عریاں مجسموں کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ دیا جاتا۔ میٹرو ہوٹل نہ صرف ادیبوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی

بلکہ ادیبوں کی بعض تحریروں میں یہ ہوٹل پس منظر کا کام بھی دیتا۔ اے حمید کے مشہور افسانے ''ڈالیاں چمن کی'' میں یہی میٹرو ہوٹل نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے کے ادیبوں کی آمدنی محدود تھی مگر پھر بھی یہ ادیب میٹرو میں بیٹھنے کی عیاشی کرتے تھے۔ کرسمس اور نیوائیر جیسے موقعوں پر میٹرو میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہُوا کرتا تھا مگر بقول انتظار حسین ادیب ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کئی روز پہلے ایڈوانس بکنگ کرا لیتے تھے۔ یہ ہوٹل رات دیر تک کھلا رہتا لیکن اینجلا کے آخری جلوہ دکھا چکنے کے ساتھ ہی محفل اُجڑنے لگتی اس کے ساتھ ہی ناصر کاظمی، انتظار حسین اور اے حمید اُٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کی اگلی منزل انارکلی کی نکڑ پر واقع ایک خستہ سا ٹی سٹال ہوتی تھی۔ کبھی کبھی چائے کے پرستاروں کا یہ مختصر سا قافلہ موچی دروازے کے قریب واقع منزل ہوٹل کی طرف بھی چل پڑتا تھا جو حضرت احسان دانش کے ایک شاگرد نے ایسے ہی چائے کے طلب گاروں کے لیے کھول رکھا تھا۔

3- چائنیز لنچ ہوم:

کافی ہاؤس اور چائنیز لنچ ہوم کی دیوار مشترک اور دروازے ساتھ ساتھ کھلتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب چائنیز لنچ ہوم، پاک ٹی ہاؤس کی ہمسری کرتا نظر آتا تھا۔ یہاں اکثر خوش خوراک ادیب اور صحافی بیٹھے نظر آتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کے نان اور سری پائے پُورے لاہور میں مشہور تھے اور یہاں کی چائے بھی پاک ٹی ہاؤس سے کم خوش ذائقہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے یہاں شاعر، ادیب، صحافی، دانشور حتیٰ کہ استاد امانت علی خان جیسے کلاسیکل گائیک بھی بیٹھا کرتے تھے۔ نہ صرف استاد امانت علی خان کی ادیبوں سے قریبی دوستیاں تھیں بلکہ میرا جی ڈے پر ہر سال کوئی بڑا اُستاد گائیک ادیبوں کے جلسے میں موسیقی بھی پیش کیا کرتا تھا۔ یوں تو یہاں ہر طرح کے ادیب شاعر بیٹھا کرتے تھے لیکن باقاعدہ بیٹھنے والوں میں اُستاد امانت علی خان، شورش کاشمیری، حمید نظامی، عبداللہ ملک، احسان دانش، میر خلیل الرحمان، سعادت حسن منٹو، حنیف رامے، آقا بیدار بخت، شاکر علی (مصوّر)، انور جلال شمزہ (مصوّر) سیف الدین سیف، حبیب جالب، ناصر کاظمی اور صلاح الدین احمد جیسے نمایاں لکھنے والے شامل ہیں۔

چائنیز لنچ ہوم میں یوں تو سبھی آتے جاتے تھے لیکن ایک شاعر ایسا بھی تھا جس کا نام چائنیز لنچ ہوم کے ساتھ لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ شاعر لدھیانہ سے ہجرت کر کے آنے والے م۔حسن لطیفی تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ان کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ ان کی تعلیم لندن اور پیرس میں ہوئی تھی اور صحافت میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی نہ صرف روانی سے بولتے تھے بلکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر دسترس بھی رکھتے تھے۔ چائے کا زبردست ذوق رکھتے تھے۔ طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی اور عام طور پر خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ اخبارات میں لکھنے کے بعد انہیں جو کچھ ملتا، اس میں سے کھانے کے بعد جو کچھ بچتا اس کی روٹیاں لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے زمانے تک چائنیز لنچ ہوم کو زبردست ادبی اہمیت حاصل رہی۔ یہاں ہر وقت ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فوٹوگرافروں، مصوّروں، وکیلوں اور پروفیسروں کا جھمگٹا لگا رہتا۔ اس ہوٹل کی فضا کشادہ، روشن اور صحت مند تھی۔ مبارک احمد نے اپنا حلقہ الگ کیا تو انہیں اسی ریستوران نے پناہ دی۔ اس کے علاوہ یہاں غضنفر علی ندیم ایک عرصے تک حلقہ تصنیف ادب کے اجلاس منعقد کرتے رہے اور پنجابی ادبی پروار کی تنقیدی نشستیں بھی اسی ریستوران میں ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر یونس احقر اس کے سیکرٹری جنرل اور ڈاکٹر محمد بشیر گورایا پنجابی ادبی پروار کے صدر تھے۔ اس پروار

میں اپنے زمانے کے ہر بڑے ادیب کو مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا جاتا تھا۔ چائنیز لنچ ہوم سے وابستہ ایک اور تنظیم ''حلقہء ادب'' کے نام سے اسّی کی دہائی میں بہت فعّال رہی ۔ یہ ترقی پسند نظریات کے ردِّ عمل میں تھی مگر اپنی بھر پور اور کامیاب ادبی نشستوں میں حلقہء ادب کو چلانے والے اہلِ قلم نے نظریاتی سطح پر ایک وسیع ہم آہنگی کو فروغ دیا ۔ حلقہء ادب میں پروفیسر مجتبیٰ حسین ، انجم رومانی ، عارف عبدالمتین ، صلاح الدین ندیم ، مظفر وارثی ، عطا الحق قاسمی ، دلدار پرویز بھٹی ، سراج منیر، ڈاکٹر تحسین فراقی ، جعفر بلوچ ، حفیظ الرحمٰن احسن ، فضل الرحمٰن ، اقبال ساجد ، آفتاب احمد، ڈاکٹر امجد طفیل ، یعقوب پرواز ، اسماعیل عاطف ، یعقوب پرواز، اصغر عابد، ڈاکٹر ضیاء الحسن، ، اشفاق ورک اور بہت سے دیگر معروف شعراء و ادباء اس حلقے کی محافل کو رونقیں بخشتے رہے۔ اسّی کی دہائی کے آخر میں جب ہم لوگوں نے ادبی حلقوں میں آنا جانا شروع کیا تو چائنیز لنچ ہوم اگرچہ موجود تھا مگر اس کی ادبی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ دراصل اس قہوہ خانے کی ساری رونقیں کافی ہاؤس اپنے ساتھ لے گیا۔ کافی ہاؤس پر تالہ پڑا تو چائنیز لنچ ہوم بھی ویران ہو گیا۔ اب یہاں ادیبوں سے زیادہ وکلاء، پی آئی اے اور پاپولیشن کے محکموں کی یونینز کے عہدیدار بیٹھا کرتے تھے۔ ادیبوں اور صحافیوں کے مرتبے بلند ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے چائنیز لنچ ہوم میں بیٹھنا ترک کر دیا، اُن کا اگلا ٹھکانہ لارڈ اور ڈین ہوٹل تھے۔ جب بڑے ادیبوں نے چائنیز لنچ ہوم سے منہ موڑ لیا تو بقول میرؔ ع

آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا

4- کافی ہاؤس:

مال روڈ پر واقع ٹولنٹن مارکیٹ کے چوک سے آپ ریگل کی طرف چلیں تو مال روڈ کی ذیلی سڑک کے شروع ہی میں بائیں ہاتھ کونے میں سن لائیٹ بلڈنگ ہوا کرتی تھی، اسی عمارت کے کونے میں انگریزی کی ادبی کتابوں کی دکان کرشنا بک ہاؤس تھی۔ اس تاریخی عمارت میں دو ریستوران ساتھ ساتھ واقع تھے۔ ان میں سے ایک چائنیز لنچ ہوم اور دوسرا کافی ہاؤس تھا۔ ساتھ ساتھ ہونے کے باعث انتظار حسین چائنیز لنچ ہوم کو ''کافی ہاؤس کا ضمیمہ'' قرار دیتے ہیں۔ کافی ہاؤس کی شہرت اور مقبولیت اپنی جگہ مگر یہاں فون نہیں تھا اس لیے شاعر ادیب فون کی سہولت سے فائدہ اُٹھانے کے لیے چائنیز لنچ ہوم پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے۔ ایک اور محتاجی بھی تھی کہ کافی ہاؤس رات 9 بجے بند ہو جاتا تھا، سو کافی ہاؤس کے نشہ باز چائے کے لیے چائنیز لنچ ہوم سے وابستہ رہنے پر مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں قہوہ خانوں میں بیٹھنے والے ادیب تقریباً مشترک ہی تھے۔

لاہور کے دو مشہور قہوہ خانے یعنی انڈیا کافی ہاؤس اور انڈیا ٹی ہاؤس دو سکھ بھائیوں کی ملکیت تھے، دونوں خوب چلتے تھے اور دونوں کی شاخیں دہلی میں بھی موجود تھیں۔[8] ان دونوں قہوہ خانوں کا ستارہ عروج پر تھا اور دونوں ہی ادب کی تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔ بظاہر کافی ہاؤس ایک کاروباری جگہ تھی مگر ادیبوں کی یہاں موجودگی نے اسے شہر کے ہزاروں قہوہ خانوں سے منفرد بنا دیا تھا۔ ایک طرف اُستاد امانت علی خان اپنے پرستاروں کے ہمراہ چائے پیتے نظر آتے تو دوسری طرف سعادت حسن منٹو اپنے چاہنے والوں کے درمیان گھرے ہوئے پائے جاتے۔ یہاں ملک بھر سے اہلِ قلم جمع ہوتے۔ کوئی ادیب کہیں سے بھی چلتا کافی ہاؤس میں چند لمحے بسر کرنے کی تمنا اسے کشاں کشاں یہاں لے آتی۔ لاہور کے نامور وکلاء، ممتاز ادیب، شاعر، ناقدین اور پنجاب یونیورسٹی اور دوسرے کالجز کے ادبیات کے اساتذہ کا ہر وقت تانتا

بندھا رہتا۔ چراغ حسن حسرت، باری علیگ، مجید نظامی، علاؤ الدین کلیم (استاد) اعجاز حسین بٹالوی، شاکر علی (مصور)، حبیب جالب، فیض، صوفی تبسم، پطرس بخاری، سیّد عابد علی عابد، ڈاکٹر تاثیر، حفیظ جالندھری، احسان دانش، راشد، شہرت بخاری، سلیم شاہد، اقبال ساجد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، مظفر علی سیّد، ناصر کاظمی اور بہت سے دوسرے قلمی ستارے کافی ہاؤس کے آسمان پر ہالہ کیے رکھتے۔ کافی ہاؤس کی یہی وہ رونق تھی جس سے اس زمانے کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ادیبوں کے ساتھ ایک کپ کافی پینے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور بعدازاں ایک روز وہ اس اعزاز سے سرفراز ہونے کے لیے واقعی کافی ہاؤس آ پہنچے۔ وزیراعظم دیر تک ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

اس کے بعد جلد ہی یہ محفلیں اُجڑنے لگیں، انڈیا کافی ہاؤس کے نام سے آغاز کرنے والے اس قہوہ خانے پر کئی طرح کے بُرے وقت آئے۔ کئی بار یہ بند ہوا اور کئی بار اس جگہ نئے کاروبار بھی شروع ہوئے مگر ادیبوں نے اس قہوہ خانے کے چکر لگانا بند نہ کیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہاں فرنیچر کی دکان کُھلی، کچھ عرصہ اس پر تالہ پڑا رہا، پھر نئی سج دھج سے کافی ہاؤس کا افتتاح ہوا، بعدازاں پھر بند ہو گیا اور اس جگہ ایک بنک کُھل گیا، اور اب عرصہ ہوا یہ ریستوران ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے اس کے آثار تک مٹ چکے تھے مگر ادیبوں کے دلوں میں آج بھی کافی ہاؤس کی یادیں اسی طرح زندہ ہیں۔

5- ہوٹل پیراڈائیز:

یہ بھی لاہور کے معروف ترین قہوہ خانوں میں سے ایک تھا۔ یہ اس جگہ ہوتا تھا جہاں آج کل گارمنٹس ڈرائی کلینرز کی دکان ہے۔[9] بعدازاں وہاں سے اُٹھ کر یہ ''سویرا'' کے دفتر کے نیچے چلا آیا۔ ''سویرا'' کا دفتر ان دنوں اس بلڈنگ میں تھا جہاں بعد میں پاپولر پکچرز کا دفتر بنا۔ بیسویں صدی کے لاہور میں پیراڈائیز ہوٹل ترقی پسندوں کا سب سے بڑا ،اڈّہ تھا۔ یہ زمانہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند ادباء کے دم قدم سے ادیب میں زبردست تحرّک تھا۔ وہ نئے نئے خوابوں کی گٹھڑیاں سَروں پر رکھے ادب میں وارد ہوئے تھے۔ وہ پرانی اور فرسودہ دنیا کو ڈھا کر اس کی جگہ ایک زیادہ پُرامن، منصفانہ اور قابلِ رہائش دنیا کی تعمیر کے لیے پُرعزم تھے۔ ترقی پسند ادیب ہر روز نئے نئے مباحث کا آغاز کرتے، ان کے مخالفین ان مباحث کو آگے بڑھاتے یا پھر ان کی مخالفت کے لیے دلائل دیا کرتے۔ صفدر میر، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، احمد راہی، اختر عکسی، اے حمید، قیوم نظر، عبداللہ ملک، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، کرشن چندر، م۔حسن لطیفی اور ابنِ انشاء سمیت یہاں ہر مکتبہء فکر اور ہر نظریئے سے تعلق رکھنے والے ادیب بیٹھتے مگر عموماً یہاں ترقی پسندوں ہی کا پلڑا بھاری نظر آتا۔ ادب میں جو ادبی معرکے ہوٹل پیراڈائیز کے حصے میں آئے وہ ٹی ہاؤس کو کہاں نصیب ہوئے ہوں گے؟

یہ قہوہ خانہ ترقی پسندوں کا گڑھ تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے چند یادگار جلسے اسی ہوٹل میں ہوئے۔ اس ہوٹل کی ایک خاص بات جو دوسرے قہوہ خانوں سے ممتاز تھی وہ یہ تھی کہ یہاں سبھی ادیبوں کا اُدھار چلتا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے ہوٹل کے باہر ایک عدد تختہء سیاہ آویزاں کر رکھا تھا۔ جب کوئی ادیب دو ماہ تک بل ادا نہ کرتا تو وہ اس کا نام جلی حروف میں تختہ سیاہ پر لکھ دیتا اور یوں ادیب شرمندگی سے بچنے کے لیے فوراً بل ادا کر دیتا۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابن

انشاء اور اے حمید نے ظہیر کاشمیری کے دستخط کرنا سیکھ لیے اور ان کے نام پر خوب جی بھر کر کھایا پیا۔ جب دو ماہ گزر گئے اور نادہندگان میں ظہیر کاشمیری کا نام بھی بورڈ پر آویزاں پایا گیا تو انہوں نے سارے معاملے کی تفتیش کی اور اتنا اونچا احتجاج کیا کہ پیراڈائیز کے در و دیوار لرز اُٹھے۔[10]

پیراڈائیز ہوٹل کا مالک سنہری رنگت والا دُبلا پتلا نوجوان تھا جس نے یو۔پی کے کسی شہر سے ہجرت کی تھی اور لاہور آ کر میکلوڈ روڈ پر ہوٹل پیراڈائیز کھولا تھا۔ یہ ہوٹل ایک طرح سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کا دفتر تھا جہاں سارا دن دُور دراز سے لوگ ترقی پسند ادیبوں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اس ہوٹل کی ساری رونقیں ادیبوں کے دم قدم سے تھیں۔ جب ''سویرا'' کا آفس میکلوڈ روڈ سے لوہاری منتقل ہوگیا تو ہوٹل پیراڈائیز ایک دم اُجڑ گیا کیونکہ ''سویرا'' کی منتقلی کے ساتھ ہی ترقی پسندوں نے بھی اپنا اگلا ٹھکانہ پاک ٹی ہاؤس کو بنا لیا تھا۔ یہ قیامِ پاکستان کا ابتدائی زمانہ تھا شروع میں بہت سے ادیب انڈیا سے پاکستان چلے آئے تھے مگر یہاں ایجنسیوں نے ان کی ناک میں ایسا دم کیا کہ بیچارے ہندوستان واپسی پر مجبور ہو گئے، ایسے ہی ادیبوں میں کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ ہوٹل پیراڈائیز کے ویران ہونے کے بعد لاہور کے ادیبوں نے چند نئے ٹھکانے تلاش کر لیے تھے۔

6- اورینٹ ہوٹل:

اگر آپ تقسیمِ ہندوستان سے پہلے کے لاہور کو یاد کریں تو میکلوڈ روڈ پر دونوں طرف آپ کو نرے اُگے ہوئے نظر آئیں گے، پارسیوں کے کچھ گھر بھی ملیں گے، قریب ہی تاریخی رسالے ''چٹان'' کا دفتر دکھائی دے گا۔ چٹان سے ذرا آگے بڑھیں تو فلیمنگ روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر پہلے یہاں ایک پارسی نے منروا ہوٹل بنایا تھا، پر عین اُسی جگہ اورینٹ ہوٹل بن گیا۔[11] قیامِ پاکستان کے بعد کے زمانوں میں یہ ہوٹل ادب اور ادیبوں کے حوالے سے بہت مقبول ہوا۔ یہاں بیٹھنے والوں میں غلام عباس، محمد حسن عسکری، اے حمید، انتظار حسین اور حفیظ ہوشیارپوری زیادہ اہم ہیں۔ حسن عسکری صاحب ان دنوں کرشن نگر میں رہتے تھے اور انہیں قہوہ خانوں میں بیٹھنا اور ادب کے حوالے سے گفتگو کرنا بے حد مرغوب تھا۔ وہ صبح اُٹھ کر پہلے گورنمنٹ کالج پہنچتے یہاں جی بھر کر ادب، فنون اور فلسفہ پر گفتگو ہوتی، ان کی اگلی منزل ریڈیو پاکستان ہوا کرتی تھی اور ہوٹل اورینٹ درمیان میں پڑتا تھا۔ یہ زمانہ لاہور میں پیدل چلنے کے لیے خاصا سازگار ہوا کرتا تھا۔ عسکری صاحب اپنے احباب کے ساتھ ہوٹل اورینٹ پہنچتے اور یہاں دیر تک ادب کی محفل جما کرتی۔ وہ اس ریستوران سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ بعدازاں اس ہوٹل پر صحافیوں کی یلغار ہوگئی، جو چائے کا آرڈر دیئے بغیر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اس غیر کاروباری روّیے کے باعث ہوٹل اورینٹ آہستہ آہستہ ویران ہوتا چلا گیا۔

7- کیفے ڈی اورینٹ:

مال روڈ پر شیزان سے ذرا آگے ریگل کی طرف یہ ریستوران واقع تھا۔ ان دنوں مال روڈ پر ہر طرف خاموشی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کسی تانگے یا موٹر کے گزرنے سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا اور اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا جاتی۔ ہوٹل کے نواح میں ایک ایسی دکان تھی جہاں موسیقی کے ساز مرمّت کیے جاتے تھے لہٰذا وقفے وقفے سے یہاں سے سُریلی آوازیں آیا کرتیں جو چائے کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ کیفے ڈی اورینٹ کے باہر سرِشام کرسیاں بچھا دی جاتیں اور یہاں اے حمید، م۔ش (صحافی)، حمید نظامی، ابنِ انشاء، باری علیگ، حسن عسکری، علی سردار جعفری جیسے ادیب اور

صحافی بیٹھے نظر آتے۔ اس کیفے کے کاؤنٹر پر ایک خوش شکل اینگلوانڈین لڑکی بیٹھا کرتی تھی لہٰذا بیشتر ادیبوں اور صحافیوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اسی کی طرف منہ کر کے بیٹھیں۔ ترقی پسند اور مخالفین کے درمیان بہت سے معرکے اسی ہوٹل سے آغاز ہوئے۔ ایک دوسرے کے خلاف کئی رسالوں کا اجراء ہوا، ایک ایسے ہی معرکے کے دوران صفدر میر کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ محض ترقی پسند ادیب ہی نہیں باقاعدہ باکسر بھی ہیں۔

پاکستانی ادب کے سوال پر عسکری صاحب اور ترقی پسندوں کے درمیان کیا کیا معرکہ آرائیاں ہوئیں یہ تو ادب کا ہر طالبعلم جانتا ہے مگر اس آگ کو بھڑکانے میں کیفے ڈی اورینٹ نے کیا کام دکھایا تھا یہ شاید بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے۔[12] کیفے ڈی اورینٹ نقی بلڈنگ کے اندر واقع ہوا کرتا تھا۔

آج نقی بلڈنگ کے اندر کئی نئی مارکیٹیں وجود میں آ چکی ہیں۔ لارڈز ہوٹل اور کیفے ڈی اورینٹ ختم ہو چکے ہیں اور اب تو وہ لوگ بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں جن کے دم سے ان ہوٹلوں کی رونقیں قائم تھیں۔

8- نگینہ بیکری:

قیامِ پاکستان کا واقعہ ایسا تھا کہ جس نے عرب ہوٹل اور اس کی شہرت کو گہنا دیا۔ صحافتی حوالے سے بھی یہ پورا علاقہ پس منظر میں چلا گیا۔ قہوہ خانوں میں اب نگینہ بیکری کے عروج کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ مال روڈ سے نئی انارکلی میں داخل ہوں تو اگلا چوک آنے سے ذرا پہلے دائیں طرف یہ بیکری واقع تھی۔ چائے کے ساتھ ساتھ بیکری کی تازہ آئٹمز دستیاب ہونے کے باعث نگینہ بیکری جلد ہی اس زمانے کے ادیبوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ یہاں ادبی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے یا نہیں البتہ یہ بات ثبوت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ قہوہ خانہ نئے نئے مباحث کے فروغ کا سبب بنا۔ پنجاب یونیورسٹی قریب ہونے کے باعث یہاں شاعروں ادیبوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کے پروفیسروں کا جھمگٹا لگا رہتا تھا اور یہی لوگ ادب کے ٹھہرے سمندر میں نئے نئے مباحث اور نظریوں کے پتھر پھینکتے رہتے تھے۔ یہاں منٹو، غلام عباس، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، وقار عظیم، اے حمید، اشفاق احمد، ریاض قادر، شہزاد احمد، جاوید شاہین، میرا جی، منیر نیازی، ن۔م۔راشد اور چائے کے رسیا ناصر کاظمی بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے۔ نگینہ بیکری شاعروں ادیبوں کے ساتھ ساتھ مصوّروں کے لیے بھی نیا ٹھکانہ تھی۔ شاکر علی نے تجریدی مصوّری کے نئے مباحث کا آغاز یہیں سے کیا۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر کافی ہاؤس تھا اس کی کشش دلوں کو زیادہ کھینچتی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ نگینہ بیکری میں بیٹھنے والے کافی ہاؤس کو پیارے ہوگئے۔ ان قہوہ خانوں کے علاوہ شیزان، سٹینڈرڈ، لورینگ، کبانہ، پرنس اور کیری ہوم جیسے ہوٹل بھی موجود تھے جو ہر وقت اپنی آغوش ادیبوں کے لیے وا رکھتے تھے اور ادیب بھی ان ہوٹلوں کو کبھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر نئے ہوٹل کو آباد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

9- پاک ٹی ہاؤس:

موسموں میں جو حیثیت بہار کے موسم کو حاصل ہے کچھ یہی مرتبہ لاہور کے قہوہ خانوں میں پاک ٹی ہاؤس کو ہمیشہ حاصل رہا۔ مال روڈ سے متصل اور نیلا گنبد کے دہانے پر واقع۔ ایم۔سی۔اے کی عمارت کے عقبی حصے میں یہ تاریخی قہوہ خانہ واقع ہے۔ ریڈ کراس اور ینگ مین کرسچین ایسوسی ایشن کا بانی جین ہنری دوناں (1828-1910) سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا

تھا۔[13] وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی شاخیں دنیا کے ہر قابلِ ذکر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس (جو اس زمانے میں انڈیا ٹی ہاؤس کہلاتا تھا) کی انتظامیہ نے اسی ادارے سے یہ قہوہ خانہ لیز پر لیا تھا۔ یوں تو لاہور میں ایک سے بڑھ کر ایک ریستوران ہیں مگر اس ریستوران کو خصوصی اور لازوال شہرت حلقہ ارباب ذوق کے باعث نصیب ہوئی۔ حلقہ ارباب ذوق اور پاک ٹی ہاؤس ہمیشہ لازم و ملزوم رہے ہیں۔ کاروباری مراکز کے وسط میں واقع ہونے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے ارضی قربت نے بھی پاک ٹی ہاؤس کی رونقوں میں اضافہ کیا۔ حلقہء اربابِ ذوق ایشیاء کی بڑی ادبی تنظیموں میں سے ایک ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو اس تنظیم کا کوئی باقاعدہ فنڈ ہے اور نہ ہی اتنی بڑی تنظیم کا کوئی اپنا دفتر ہے۔ اس پُورے عرصے میں پاک ٹی ہاؤس ہی حلقہء اربابِ ذوق کے دفتر کا کام دیتا رہا۔ پاک ٹی ہاؤس کو دیکھنے اور یہاں بیٹھنے والے نامور ادیبوں اور شاعروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پوری دنیا سے ادب دوست حضرات لاہور آتے رہتے ہیں۔ ساٹھ کی دہائی میں تو امریکہ کے معروف شعراء پال اینگل، کارولین کائزر اور Jeasse Stuart بھی حلقہء اربابِ ذوق کے جلسوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے پاک ٹی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھ کر نہ صرف حلقے کی کارروائی میں حصہ لیا بلکہ پاک ٹی ہاؤس کی لذیذ چائے سے بھی لطف اندوز ہوئے۔[14]

حلقہء اربابِ ذوق کے ابتدائی زمانے میں حلقے کے اجلاس وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں ہوا کرتے تھے جبکہ اراکین کے لیے چائے کا انتظام پاک ٹی ہاؤس میں کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بیشتر ادیب صرف اتوار کی شام پاک ٹی ہاؤس آیا کرتے تھے۔ بعدازاں جب حلقے کی تنقیدی نشستیں پاک ٹی ہاؤس منتقل ہوگئیں تو ادیب عام دنوں میں بھی پاک ٹی ہاؤس آنے لگے۔ پاک ٹی ہاؤس کے ابتدائی آبادکاروں میں میراجی، سیف الدین سیف، اعجاز حسین بٹالوی، امجد الطاف، احسان دانش، حفیظ جالندھری، ریاض احمد، ابراہیم جلیس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، شوکت صدیقی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، دیوندر ناتھ جیسے ادیب شامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے ایک عرصہ بعد تک بھی اس قہوہ خانے کی پیشانی پر انڈیا ٹی ہاؤس کی تختی سجی رہی اور جب مختلف چیزوں کو پاکستانیات کے رنگ میں رنگنے کی تحریک شروع ہوئی تو ایک دن اس قہوہ خانے کے ماتھے پر بھی پاک ٹی ہاؤس کی تختی سجا دی گئی۔ ہجرت نے بھی ٹی ہاؤس کی آبادکاری میں اہم کردار ادا کیا۔ نئے آباد کار لُٹ لٹا کر پاکستان پہنچے تھے لہٰذا جلد ہی ٹی ہاؤس نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ نئے آنے والوں کا یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ اے حمید، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، ابنِ انشاء، صفدر میر جیسے لوگ صبح آٹھ نو بجے تک اپنے گھروں سے نکل کر پاک ٹی ہاؤس آجاتے اور رات گئے تک یہیں بیٹھے رہتے۔ ٹی ہاؤس کی زندگی میں یہ دن بھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس ٹیبل پر قیوم نظر، انور جلال شمزا، اور منٹو کے قہقہے گونج رہے ہیں اور دوسری میز پر ظہیر کاشمیری، صفدر میر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر اور عبداللہ ملک جدلیاتی قدروں پر بحث کر رہے ہیں، تیسری میز پر کالے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والا ناصر کاظمی، سلیم شاہد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، مظفر علی سیّد، انتظار حسین، انجم رومانی، زاہد ڈار اور شہرت بخاری کو اپنی تازہ غزل سنا رہا ہے اور چوتھی میز پر احمد بشیر، شہزاد احمد، عارف عبدالمتین، انور سجاد، کمال احمد رضوی اور سجاد باقر رضوی ادب کے کسی نئے مباحثے پر اپنے دلائل دینے میں مصروف ہیں جبکہ سامنے والی میز پر یوسف ظفر، مختار صدیقی، اشفاق احمد، احمد راہی، منیر نیازی، ضیاء جالندھری اور قتیل شفائی چائے کے دوران خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔

کوئی راتوں کو ویران سڑکوں کی گشت کے دوران تازہ غزلیں کہہ رہا ہے تو کوئی دن کے اُجالے میں نئے افسانے

کے کردار تلاش کرتا پھر رہا ہے مگر اگلی صبح جب یہ لوگ ٹی ہاؤس میں جمع ہوتے تو ایک دوسرے کے اشعار اور افسانوں پر جی بھر کر داد دیتے۔ اس ماحول میں ادیبوں کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی آیا کرتے تے۔ بعض ٹی ہاؤس کا لذیذ کھانا کھا کر رخصت ہو جاتے تو بعض ادیبوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ بھی لگاتے۔ ٹی ہاؤس کے عروج کے سامنے اب دوسرے قہوہ خانوں کے چراغ مدھم پڑنے لگے تھے۔ مثلاً ناصر کاظمی کے ٹی ہاؤس اُٹھ آنے سے کافی ہاؤس کی رونقیں ماند پڑنے لگی تھیں، گورنمنٹ کالج کی ادب نوازی بھی ٹی ہاؤس کی رونقوں میں اضافے کا باعث بنی، انجمن ترقی پسند مصنفین کی محفل اُجڑی تو ترقی پسندوں نے بھی ٹی ہاؤس ہی کا رُخ کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا جب دوسرے قہوہ خانوں کی ندیاں ایک ایک کر کے ٹی ہاؤس کے دریا ہی میں گرنے لگیں۔

بظاہر یہ ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ ہے مگر نیلے گنبد میں ٹائروں کا کاروبار بھی ترقی پذیر ہے اور للچائی نظروں سے اس قدیم قہوہ خانے کو دیکھ رہا ہے۔ اس زمانے میں عام ادیب اس نئی یلغار کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر اے حمید نے اس زمانے میں بھی ٹی ہاؤس کے بارے میں ایک غیر معمولی پیشگوئی کر دی تھی۔

> ''پاک ٹی ہاؤس چل رہا ہے مگر نہ چلنے کے برابر ہے۔ نیلے گنبد میں آٹو سپیئر پارٹس اور خاص طور پر ٹائروں کی بزنس کی یلغار ٹی ہاؤس تک پہنچ چکی ہے۔ لگتا ہے جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب پاک ٹی ہاؤس کی جگہ اس کی پیشانی پر ''پاک ٹائر ہاؤس'' لکھا ہوا ہوگا۔''[15]

اور پھر وہ وقت آ ہی گیا جب ٹی ہاؤس کے دروازے پر تالہ پڑ گیا اور ادیب بے گھر ہو گئے۔ شنید تھی کہ اسے پاک ٹائر ہاؤس میں تبدیل کیا جا رہا ہے اور اس مقصد کے لیے اس تاریخی قہوہ خانے میں کچھ ٹائر سٹور بھی کر لیے گئے تھے۔ ٹی ہاؤس کی اس موت پر ادیبوں نے آنسو بہائے، کالم نگاروں نے درد بھرے کالم لکھے اور شاعروں نے مرحوم قہوہ خانے کے نوحے رقم کیے۔ ٹی ہاؤس کی انتظامیہ نے کورٹ کا رُخ کر لیا اور یوں ٹی ہاؤس کا جھگڑا کئی سال چلتا رہا۔ اس دوران حکومتی ادارے بھی حرکت میں آتے رہے اور یوں ادیبوں کے بیٹھنے کے لیے دو نئی جگہوں کا اہتمام کیا گیا۔ ان میں ایک تو ناصر باغ کے قلب میں ''چوپال'' سجائی گئی اور یوں حلقہ اربابِ ذوق یہاں منتقل ہو گیا۔ حلقے کے علاوہ بعض دوسری ادبی تنظیمیں بھی یہاں اپنے اجلاس منعقد کرنے لگیں۔ ادھر حکومت نے لاہور آرٹس کونسل جیسی خوبصورت جگہ پر ادیبوں کے بیٹھنے کے لیے ''ادبی بیٹھک'' کھول دی جو، اب بھی موجود ہے۔ حلقے کے ''چوپال'' سے ایوانِ اقبال منتقل ہو جانے کے نتیجے میں ''چوپال'' اور ''ادبی بیٹھک'' کے علاوہ ادیبوں کے ہاتھ بیٹھنے کا ایک تیسرا ٹھکانہ بھی میسر آ گیا لیکن اس کے باوجود ادیبوں کے دلوں سے پاک ٹی ہاؤس کی یادیں کبھی محو نہ ہو سکیں۔ ''ادبی بیٹھک'' کی بیوروکریٹک فضا میں کچھ ادیب اپنے میلے کچیلے ٹی ہاؤس، اس کے پرانے فرنیچر اور الٰہی بخش اور رفیع جیسے گندے مندے ویٹروں کو یاد کر کے آہیں بھرتے رہے۔ ٹی ہاؤس کی بندش سے ادیب نہ صرف بے گھر ہوئے بلکہ ان کا ادبی مرکز بھی بکھر گیا۔ پہلے تو وہ کم از کم ہفتہ وار ہی سہی ، یہاں جمع ہوتے تھے، ملتے ملاتے اور ایک دوسرے سے گپ شپ کیا کرتے تھے مگر اب وہ دربدر ہو گئے تھے۔

ٹی ہاؤس کو بند ہوئے جب کافی عرصہ گزر گیا تو ایک روز اچانک یہ اطلاع ادبی حلقوں میں بہت حیرت اور مسرت کے ساتھ سُنی گئی کہ پاک ٹی ہاؤس کا ایک نئے رنگ و روپ سے دوبارہ افتتاح ہو رہا ہے اور پھر واقعی ٹی ہاؤس ایک نئی سج دھج کے ساتھ سامنے آیا۔ اس آبادکاری کے پیچھے حکومتی حلقوں میں موجود عطاء الحق قاسمی اور شعیب بن عزیز جیسے

دوستوں کا ہاتھ ہے۔ نیاٹی ہاؤس ہے تو پرانے والا مگر اب کی بار اس کے فرنیچر سے لے کر ویٹروں تک نئے ہیں۔ ادیبوں کو گرمی سے بچانے کے لیے جگہ جگہ ائیر کنڈیشنر بھی آویزاں ہیں اور کھانے اور چائے کی قیمت پہلے سے زیادہ مگر مہنگائی کے لحاظ سے مناسب ہے۔ حلقہ اربابِ ذوق ایک بار پھر ٹی ہاؤس میں واپس آچکا ہے۔ ادیبوں نے بھی آنا جانا شروع کر دیا ہے مگر اب بھی ادیبوں کے دلوں میں کوئی انجانا خوف سانس لے رہا ہے اور وہ ایک دھڑکے، کے ساتھ ٹی ہاؤس آتے ہیں۔ اللہ کرے پاک ٹی ہاؤس کی رونقیں دوبارہ بحال ہوں اور اب کوئی ادیبوں کو بے گھر کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے۔

موجودہ عہد دراصل ہوٹلوں اور پلازوں کا عہد ہے۔ لاہور کے بیشتر سینما ہاؤسز کو گرا کر پلازوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے انسان کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ ذہنی زندگی کی طرف توجہ دیں، ٹی وی چینلز، ایف ایم ریڈیوز، انٹرنیٹ، فیس بک اور موبائل نے ادب سمیت ثقافتی سرگرمیوں کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے۔ آج ادیب اور شاعر ہمارے ہیروز نہیں رہے۔ ہم اس معاشرے ہی کو مسمار کر رہے ہیں جس میں ادیبوں اور قہوہ خانوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ قہوہ خانے ہمیں خال خال ہی نظر آتے ہیں جو ہماری ذہنی زندگی کے ترجمان تھے اور جہاں سے مباحث جنم لے کر سارے ملک میں پھیلتے تھے۔ اب ہمارا تعارف صرف معدہ ہے شاید ہمیں ذہنی زندگی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

حوالہ جات

1- یاسر جواد، (مترجم) لاہور، نگارشات، لاہور، 2011ء، ص14
2- سیّد محمد لطیف، تاریخ لاہور، تخلیقات، لاہور، 2010ء، ص471
3- کنہیا لال، تاریخ لاہور، تخلیقات، لاہور، 2012ء، ص28
4- اے حمید، لاہور لاہور اے، الفیصل، لاہور، 2008ء، ص159
5- گوپال متّل، لاہور کا جو ذکر کیا، سنگِ میل، لاہور، 2004ء، ص36
6- منیر احمد منیر، اب وہ لاہور کہاں، آتش فشاں، لاہور، 2011ء، ص73
7- اے حمید، یادوں کے گلاب، مکتبہء عالیہ، لاہور، 2007ء، ص34
8- اے حمید، لاہور لاہور اے، ص135
9- اے حمید، یادوں کے گلاب، ص24
10- اے حمید، لاہور لاہور اے، ص6
11- منیر احمد منیر، اب وہ لاہور کہاں، ص40
12- انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگِ میل، لاہور، 2012ء، ص31
13- خالد اقبال یاسر، محمد ارشد رازی، نوبل انعام کے ایک سو تین سال، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2004ء، ص33
14- یونس جاوید، حلقہء اربابِ ذوق، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور، 1984ء، ص181
15- اے حمید، لاہور لاہور اے، ص135